محمدی بیگم کے ناولوں میں خواتین کے معاشرتی رویوں کی عکاسی

حمیرا اشفاق

ABSTRACT:

The study is aimed to highlight the social conditions of Colonial India in late 19thand early 20thcentury, with special refrence to gender equity.The traditionalist as well as the modernists of the said era,though opponant to each other but they were on the same page regarding women's rights and their education.Even the enlightened person like Sir sayyed was strong opponent of female 's formal education.The stage of the society was all set for male education.

In this context Molvi Mumtaz Ali and his wife Muhammade Begum took the banner of women 's rights in last decade of 19th century India. They started a weekly women 's journal Tehzeeb-E- Niswan in 1898.

In this context the study is also lighted the role of Muhammade Begum as creative writer of Urdu Language and a social reformer.She wrote novels, lullibies,poems for kids,guide books to reform the society.In her novels she narrated different issues of women such as matriarchal set up which was upsetting the women of that era.She criticized illiterate female charachters and urged them for education without using revolutionary vocabolary .we can find true and clear pictures of women's social behaviours in early 20th cetury.In this study we may find two way picture of the society.eg social behaviours towards women and women' s attitudes to deal their lives in conservative society. Muhammadi Begum's novels provide deep study of the socitey as compare to her contemporary male writers with special refrence to women's social behaviours.

کلیدی الفاظ:
حقوقِ نسواں، معاشرتی رویے۔نو آبادیاتی ہندوستان ۔بچپن کی منگنی۔توہمات۔استحصالی رویے۔پردہ ۔تعلیمِ نسواں۔خواتین ناول نگار۔انگریزی تہذیب کے اثرات۔زبان کا تخلیقی استعمال۔تہذیب نسواں۔شریف بیبیوں کے مدرسے۔رسمی تعلیم ۔شعورِ بیداریٔ نسواں

انیسویں صدی سیاسی اور سماجی حوالوں سے بڑی اہمیت کی حامل ہے۔نو آبادیاتی ہندوستان میں کئی پرانی قدروں کی شکست اور نئی قدروں کی بازیافت جاری تھی۔قدیم اور جدید کی اس کشمکش نے کئی بحثوں کو فروغ دیا جن میں جدید تعلیم کا حصول ایک ایسا مسئلہ بن کر سامنے آیا جس نے ہندوستانی مسلمانوں کو دو دھڑوں میں تقسیم کر دیا ۔ایک طبقہ جو جدید تعلیم کا حصول چاہتا تھا، اسے انگریزوں کا وفادار کہہ کر کفر کے فتوے لگائے گئے جبکہ دوسرا طبقہ سرے سے انگریز یا انگریزی تعلیم کو ہندوستان میں دیکھنا ہی نہیں چاہتا تھا۔اس تمام بحث میں جدید خیالات رکھنے والا ہو یا کٹر روایت پسندخواتین کے لیے رسمی تعلیم کی مذمت کرنے کے حوالے سے دونوں طبقات بلا شبہ متفق تھے۔یہاں تک کہ جدید تعلیم کے لیے دن رات کوششیں کرنے والے اور جدید طرزِ فکر کے حامی سر سید احمد خان بھی خواتین کی رسمی تعلیم کے حق میں نہ تھے۔وہ خواتین کے لیے گھر کے اندر ابتدائی سطح کی تعلیم کو کافی سمجھتے تھے۔

ان کا ایک خطاب جو انھوں نے خواتینِ پنجاب سے کیاان کے خیالات کا بہترین عکاس ہے(۱) ۔اسی نظامِ فکر کے تحت ان کے ساتھیوں نے بھی عورت کے حقوق کی گھر کے اندر فراہمی کے حق میں آواز تو اٹھائی لیکن اسے گھر کی چار دیواری سے باہر نکل کر معاشرے میں کوئی تعمیری کردار ادا کرنے کی سخت مخالفت کی۔شیخ عبداللہ سر سیداحمد خان کے قریبی ساتھیوں میں سے تھے وہ اس اختلافی صورتِ حال کے حوالے سے ایک یادداشت کو یوں قلم بند کرتے ہیں:

> ''صاحب زادہ آفتاب احمد خان صاحب اور مولوی ممتاز علی صاحب نے اس کی تائید کی۔اور بھی چند اولڈ بوائز نوجوانوں نے اس مسئلہ پر تقریر کی لیکن پرانی تعلیم کے مسلمان کچھ اس طرف متوجہ نہ ہوئے۔لیکن نواب محسن الملک مرحوم اس تحریک کے موافق تھے۔سر سید اور ان کے دیگر احباب اس کے مخالف تھے۔مجھے یاد ہے کہ جب خواجہ صاحب سر سید سے ملنے گئے تو سر سید نے ان کی تعلیمِ نسواں کی حمایت کا مضحکہ اڑایا۔اور ابھی وہ کمرے میں گھسنے بھی نہ پائے تھے،کہا کہ کیا تم پردے سے باہر نکل آئے ہو۔مجھے یاد ہے کہ کسی موقع پر اس زمانے میں ،میں نے بھی سر سید سے عرض کیا کہ لڑکیوں کی تعلیم کا انتظام ضروری ہے۔سر سید نے فرمایا کہ موجودہ طرز کے مدارس میں پڑھ کر لڑکیاں بد اخلاق ہو جائیں گی اور ان کے دوست شمس العلماء حافظ ڈاکٹر نذیر احمد صاحب دہلوی جو اس وقت ان کے پاس بیٹھے تھے کہا کہ میاں کیا تم لڑکیوں کے

لیے مدرسہ قائمن کرنا چاہتے ہو،انگریزی مدارس میں پڑھ کر ہڑ دنگیاں ہو جائیں گی۔(۲)

روایت پسند طبقے نے خواتین کے لیے رسمی تعلیم کو مغربی تہذیب کی یلغار قرار دیتے ہوئے اسے مشرقی اقدار سے بغاوت قرار دیا۔تعلیم کے حصول میں پردے کا حد سے بڑھا ہوا رجحان بھی ایک وجہ تھی جس سے باقاعدہ تعلیم کے کے لیے گھر سے نکلنا بطورِ خاص اشرافیہ کی خواتین کے لیے زیادہ معیوب سمجھا جا تا تھا۔اگرچہ ای ۔ڈی بیتھون(J.E.D Bethune,1801-1891)(۳) کی کوششوں سے لڑکیوں کے سکولوں کے لیے فنڈز فراہم کیے گئے لیکن مسلم خاندان جنگِ آزادی کی وجہ سے ان سکولوں کو ناپسند کرتے تھے اورانہیں خوف تھا کہ دیگر مذاہب کی لڑکیوں سے ان کا میل ملاپ ہوگا۔ یہی وجہ تھی کہ مسلم گھرانوں کی لڑکیاں ان سکولوں سے فیض حاصل نہ کرسکیں۔پھر ایک اور توجیہہ جولڑکیوں کے لیے بطور عذر پیش کی جاتی تھی کہ یہ لکھنا جان لیں گی تو نامحرموں کو خط لکھیں گی۔اس طرح کے اوہام نے مسلم گھرانوں میں باقاعدہ تعلیم کے لیے کئی طرح کی رکاوٹیں پیدا کر دی گئی تھیں۔یہی وہ رویے تھے جوخواتین کی تعلیم کے راستے میں مزاحم تھے۔

> Women 's Education in the nineteenth century was the result of the modernising effects of British colonialism and the rise of reform movements both among Hindus and Muslims....This late begining of such a movement and its slow progress during three first quarter of the twentith century,was to a very great degree the result of the presisting traditionalist attitude among the common people as well as the elite groups as a dominant trend,which tended to perpetuate the social constraints from which Muslim women suffered.In other words ,Muslim conservatism was responsible for the unsatisfactory educational status of Muslim women.(4)

نوآبادیاتی ہندوستان میں جدیدیت کی لہر کسی نہ کسی حد تک عوام وخواص پر اپنے اثرات مرتب کر رہی تھی۔کئی باشعور افراد ہندوستانی معاشرے کے دوہرے معیارِ زندگی کا بغور جائزہ لے رہے تھے۔وہ دیکھ رہے تھے کہ کس طرح مذہب کو آڑ بناتے ہوئے خواتین کے حقوق کی پامالی کی جا رہی ہے جن میں علم حاصل کرنے کا حق بھی شامل ہے۔اس ضمن میں مولوی ممتاز علی کی کاوشیں قابلِ ذکر ہیں جنھوں نے بیسویں صدی کے آغاز سے بھی قبل خواتین کے حقوق کے لیے باقاعدہ آواز اٹھائی۔ان کی کتاب ''حقوقِ نسواں'' خواتین کے ساتھ جوڑی گئی توہمات کو قرآن و حدیث کی روشنی میں رد کرتی ہے۔ یہ کتاب سرسید احمد خان کو قبل از وقت ایک کوشش لگی اور انہوں نے مسودہ دکھانے پر مولوی ممتاز علی پر خفگی کا اظہار کیا۔یہ کتاب سرسید احمد خان کے انتقال کے بعد مولوی ممتاز علی نے

۱۸۹۸ء میں دار لاشاعت لاہور سے شائع کی ۔(۵)اسی سال خواتین کے لیے شائع ہونے والا مجلّہ'' تہذیب النسواں'' (۶)بھی منظر عام پر آیا جو ان کی اہلیہ محمدی بیگم نے جاری کیا۔مولوی ممتاز علی اور محمدی بیگم خواتین کے ساتھ ہونے والے استحصال پر خاموش نہ رہ سکے اور انہوں نے قلم کے ذریعے خواتین کے حقوق کی جنگ لڑی۔ یہ دونوں اہلِ دانش اپنے اردگرد کے معاشرتی رویوں کو جانتے تھے،اور اس ردِعمل کی بھی یقیناً توقع رکھتے ہوں گے جو انہیں اپنے معاصرین کی طرف سے پیش آیا۔لیکن اس سب کے باوجود انہوں نے اس جامدنظامِ زندگی میں تحرک پیدا کیا اور عام روایتی طریقوں سے ہٹ کرمحمدی بیگم اپنے نام کے پردے سے بغاوت کرتے ہوئے اردو ادب کے منظر نامے پر جلوہ گر ہوئیں۔جبکہ اس وقت خواتین کے ناموں کا اخفاء بھی شرفاء میں عام تھا جیسا کہ'ز۔خ۔ش' یا بنت لباقر یا امت الوحی وغیرہ۔آج کے دور کی مناسبت سے کسی خاتون کا اس کے اپنے نام سے لکھنا ایک عام بات ہو لیکن انیسویں صدی کے آخری اور بیسویں صدی کے اوائل عشروں میں یہ ایک بڑا قدم تھا۔

> '''اس زمانہ میں خواتین کا پڑھنا لکھنا معیوب سمجھا جاتا تھا اور مسلم معاشرے کی ایک روایت یہ تھی کہ شریف زادیاں اپنا نام نہیں ظاہر کرتی تھیں ۔اس لیے پٹنہ صوبہ بہار کی اس خاتون نے بھی'' اصلاح النساء'' اپنا تعارف اصل نام کی بجائے یوں کرایا تھا''والدہ محمد سلیمان بنت سید وحیدالدین خان وہمشیرہ سیدامدادامام اثر''(۷)

مندرجہ بالا حقائق کی روشنی میں محمدی بیگم کے تخلیقی سفر کا آغاز بلا شبہ خواتین کے تشخص میں ایک اہم سنگِ میل کی حیثیت رکھتا تھا۔اگرچہ انہیں اس کی بھاری قیمت چکانا پڑی۔انہیں اور ان کے شوہر مولوی ممتاز علی کو ایسے خط بھی ملے جن میں فحش گالیاں درج ہوتی تھیں۔صرف یہی نہیں بلکہ ان کے گھر کے در و دیوار کو بھی اسی قسم کی مغلظات سے آلودہ کیا جاتا تھا۔ لاہور کے چندکٹر روایت پسند بزرگوں نے ایک طوائف''اللہ دی نزاکت'' نامی سے ایک زنانہ اخبار جاری کروایا جس سے''تہذیب نسواں'' کی تضحیک کا پہلو نکلتا تھا۔مولوی ممتاز علی کا ایک واقعہ محمد اسماعیل پانی پتی ان کی زبانی یوں درج کرتے ہیں۔

> ''ایک مرتبہ ایک مقامی اخبار نے بڑے طنز کے ساتھ لکھا کہ''انگریزوں کے راج کی برکت ہے کہ تعلیم روز بروز عام ہو رہی ہے اور تصنیفات اور اخبارات کو ترقی ہے ۔۔۔۔اخبار ابھی تک (صرف) مردوں تک محدود تھے۔مگر اب عورتوں کے اخبار بھی جاری ہونے لگے ہیں۔چنانچہ دو شریف زادیوں''اللہ دی نزاکت'' اور''محمدی بیگم'' نے اس'' نیک'' کام کی طرف توجہ کی ہے۔میری اہلیہ کو اس بات سے کہ میرا نام ایک کسبی کے ساتھ ملا کر ایک ہی سطر میں لکھا گیا ہے، بے انتہا صدمہ ہوا اور وہ بہت دیر تک روتی رہیں۔''(۸)

محمدی بیگم نے صرف انیس سال کی عمر میں''تہذیب النسواں'' کی ادارت سنبھالی مگر آخری سانس تک اسی جذبے سے جاری رکھا جس کے تحت انہوں نے یہ جریدہ خواتین کی ذہنی تربیت اور ان کے لیے اصلاح و ترقی کی غرض سے

شروع کیا تھا۔ پہلی خاتون مدیر کی حیثیت سے انیسویں اور بیسویں صدی کی صحافت میں ان کا نام ہمیشہ زندہ رہے گا۔(۹)

محمدی بیگم پر الگ سے کوئی تحقیقی یا تنقیدی کام سامنے نہیں آیا۔اس دور کے متعلق جتنی بھی کتابیں لکھی گئیں وہ محمدی بیگم اور تہذیبِ نسواں کے ذکر کے بغیر نامکمل ہیں ۔مستشرقین نے بھی کئی حوالوں سے اس دور کی خواتین کی ذہنی صلاحیتوں کا اقرار کرتے ہوئے بڑے اہم کام کیے ہیں جن میں گیل مینو(Gail Minaualt) کی کتاب The SecludedScholars قابلِ ذکر ہے۔وہ محمدی بیگم اور ان کے دور کے متعلق لکھتی ہیں کہ:

> "The content of Muhammadi Begum's writings reflected the content of Tehzib-un-Niswan during its first ten years under her editorship.The bulk of the articles in Tehzib were aimed at the Purdah-observing woman at home,focusing on her need for broadened horizons through the medium of this publications.Articles disscussed education,housekeeping and child care,gave recipes,.....A costant theme was the reform and simplification of custom and the need to eliminate wasteful expenditure on rituals and ornaments,a refrain in the work of other reformers including her husband."(10)

انور شاہین کا تحقیقی مقالہ(Patriarchal Education and Print Journalism: their emancipating impact on Muslim Women India during 1869-1908) (۱۱)،عذرا اصغر علی کے مقالے(The emergence of Reformist Literature about Indian Muslim Women in Urdu Language) میں بھی نو آبادیاتی عہد میں خواتین کی صورتِ حال کا بہت گہرائی سے تجزیہ کیا گیا ہے۔ (۱۲) سی ایم نعیم اپنے مضمون" "Meet Bibi Ashraf میں محمدی بیگم کی تحریر کردہ سوانح" حیات اشرف" کے مرکزی کردار بی بی اشرف کو تحقیق کی روشنی میں دیکھتے ہیں(۱۳)۔رؤف پاریکھ کے مضمون" and Tehzeeb i-Literary Notes: Muhammadi Niswan میں محمدی بیگم کی تصانیف کا مختصر تعارف اور ان کی صحافتی خدمات کا جائزہ لیا گیا ہے۔(۱۴)اگرچہ اردو ادب اور اردو صحافت کے فروغ میں خواتین کا حصہ اپنے معیار اور مقدار دونوں حوالوں سے قابلِ ذکر ہے۔لیکن ایک افسوس ناک امر یہ ہے کہ مردوں کی ادبی خدمات پر جس قدر تصانیف کا انبار ملتا ہے خواتین کا ذکر اس کا عشرِ عشیر بھی نہیں۔حتیٰ کہ اردو ادب کی لکھی گئی تواریخ بھی اس حوالے

سے تشنگی کا شکار ہیں۔محمدی بیگم پر ایک اور مقالہ بعنوان ''محمدی بیگم کی علمی اور ادبی تصانیف کا تحقیقی جائزہ''مجلّہ ''خیابان'' میں شائع ہوا۔مقالہ نگار ڈاکٹر ریحانہ کوثر نے بڑی تفصیل سے محمدی بیگم پر ہونے والے کاموں کا تجزیہ کیا ہے لیکن ان کی تصانیف کے بنیادی حوالوں کی کمی کو بجا طور پر محسوس کیا جا سکتا ہے۔مندرجہ بالا پس منظری مطالعے کی روشنی میں اس امر کی ضرورت محسوس کی گئی کہ محمدی بیگم کے ناولوں کو اس دور کے معاشرتی تناظر میں رکھ کر پرکھا جائے تو شمالی ہندوستان میں بسنے والی خواتین ان کا طرز زندگی ،ان کے مسائل اور اس دور کی خواتین کا اسلوبِ بیان پوری طرح متشکل ہو جاتا ہے۔

محمدی بیگم ایک تخلیقی اور علمی استعداد رکھنے والی خاتون تھیں ،صرف یہی نہیں بلکہ وہ اپنی ہم جنسوں کے مسائل دیکھ دیکھ کر کڑھتی تھیں،ان کے خیال میں یہ مسائل صرف مردوں یا معاشرے کے پیدا کردہ نہ تھے بلکہ وہ ایک گہرے مشاہدے اور تجزیے کے بعد اس نتیجے پر پہنچی تھیں کہ اگر خواتین خود اپنی کاوش سے اپنی ذہنی اور علمی تربیت کریں تو بہت سے مسائل سے بچ سکتی ہیں۔وہ ان خواتین کو جو کسی وجہ سے خود کو معاشی ضرورتوں کے لیے مرد کا محتاج سمجھتی تھیں ان کو گھر کی چار دیواری کے اندر بیٹھ کر ذریعۂ معاش پیدا کرنے کا درس بھی دیتی ہیں۔وہ صرف غم کی تصویر بنے حالات کے آگے سرنگوں ہونے کی بات نہیں کرتیں بلکہ انہیں تلقین کرتی ہیں کہ گھر کے معاشی معاملات میں بھی اپنا کردار ادا کریں تا کہ مرد اور عورت مل کر زندگی کی گاڑی کو بہتر انداز میں چلا سکیں۔اس کی ایک جھلک محمدی بیگم کی تحریر کردہ سوانح عمری ''حیاتِ اشرف'' میں دیکھی جا سکتی ہے۔(۱۵)

ان کا مقصد معاشرے کو بی بی اشرف جیسی روشن مثالوں سے روشناس کرانا تھا جنہوں نے نہ صرف نامساعد حالات میں تعلیم حاصل کرنے کا سفر جاری رکھا بلکہ جب بیوگی کا دکھ جھیلنا پڑا تو استانی کے فرائض ادا کرتے ہوئے دو یتیم بچیوں کے ساتھ عزت اور وقار کی زندگی بسر کی۔ساتھ ہی اس بات کا بھی بار بار ذکر ملتا ہے کہ اشرف بی بی پردے اور اسلامی تعلیمات کی کس قدر پاسدار تھیں۔گویا وہ خواتین کے لیے ان کی زندگی کو ایک ایسا نمونہ بنا کر پیش کرتی ہیں جن کے ذریعے دین اور دنیا کا سفر آسانی طے کیا جا سکتا ہے۔محمدی بیگم نے جہاں بطور سوانح نگار،مضمون نگار،ناول نگار کے اپنی تخلیقی صلاحیتوں کا لوہا منوایا،وہیں انہوں نے بچوں کے لیے نظمیں(۱۶) اور خواتین کے میل جول کے آداب (۱۷) اور امورِ خانہ داری(۱۸) سے متعلق کئی کتابیں لکھیں،ان کے کئی مضامین دیگر معاصر جرائد میں شائع ہوتے رہے۔

ان کی تحریروں میں اس وقت کا معاشرہ اپنی تمام تر جزئیات کے ساتھ سانس لیتا محسوس ہوتا ہے۔اس وقت کے معاشرے میں تین تہذیبیں اپنے بھرپور اظہار کے ساتھ اپنی اپنی شناخت کے اثرات لیے ہندوستانی معاشرے میں متوازی چل رہی تھیں۔کبھی ایک تہذیب دوسرے پر غالب آنے کی کوشش کرتی اور کبھی دوسری تیسری تہذیب کو اپنے حلقۂ اثر میں لے لیتی۔ابتدائی ناول نگاروں بالخصوص نذیر احمد کے ناولوں میں شناخت کا یہ مسئلہ پوری کشمکش کے ساتھ پیش کیا گیا۔جب مولوی صاحب کے کردار صفحات در صفحات ان کے وعظ ونصیحت کا بوجھ اٹھائے مشرق کی بڑائی اور مغربی تہذیب کے مضر اثرات پیش کرتے ہیں تو ان کے ناولوں کا حسن ماند پڑ جاتا ہے۔ جبکہ محمدی

بیگم کے ناولوں میں معاشرتی رویوں کی عکاسی بڑی وضاحت سے کی گئی ہے لیکن کہیں پر بھی نظریاتی کشمکش تصادم کی شکل اختیار نہیں کرتی۔

انگریزی تہذیب کے اثرات انیسویں صدی کے اوائل میں ہی مزاحمت کے باوجود گھروں میں پہنچنے لگے تھے۔جس میں بول چال کے ساتھ ساتھ رہن سہن کا طرز،رویے اور عام استعمال کی اشیاء سب میں یہ نفوذ بآسانی دیکھا جا سکتا ہے۔''صفیہ بیگم'' میں تہذیب کو براہ راست تو موضوع نہیں بنایا گیا اور نہ ہی کسی دوسری تہذیب پر سبقت یا بڑائی دکھانا مقصود ہے۔بلکہ اس ناول میں مرکزی کرداروں کے مکالمے،ناول کی فضا اوراسلام کے حوالے سے جدید اور قدیم تصورات کا تجزیہ کرتے ہوئے انگریزی تہذیب کے اثرات کو کہانی کے اندر بڑی نفاست سے پیش کرتے ہیں۔

جب صفیہ تصویر بنانے لگتی ہے تو اسے ماں کی طرف سے شدید ردِعمل کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

> ''ہسپتال کی مس تصویر بنانی بھی جانتی تھیں۔انھوں نے اس کو بھی تصویروں کا شوق لگادیا۔اب دیکھوتو بیسیوں تصویریں اس کے ہاتھ کی بنی ہوئی ہیں۔اپنے گھر والوں کی اور اپنی سہیلیوں کی سب کی تصویریں اتار رکھی ہیں۔جوتصویر پسند آئے گی اس کی تصویر اتار کر رکھ لے گی۔بہتیرا کہتی ہوں کہ صفیہ سب ہی کام کرنا مگر یہ بت پرستی مجھے نہیں بھاتی ان بتوں میں جان کہاں سے ڈالوگی؟بیوی وہ مجھ سے بحث کرتی ہے اور جانے کیا کیا حدیثیں بتا کر کہتی ہے کہ وہ اور تصویریں ہیں جن کا بنانا گناہ ہے''(۱۹)

ناول میں پیش کی گئی منظر کشی میں بھی انگریزی آرائش و زیبائش سے متعلق اشیاء کا ذکر اس دور کے طرزِ زندگی کا مظہر ہے مثلاً صفیہ کے کمرے کا منظر کچھ یوں پیش کیا گیا ہے۔''دوسری میز پر سلائی کی مشین اور چند خوبصورت انگریزی بیلیں جوصفیہ نے اپنے ہاتھ سے بنائی تھیں''(۲۰) صفیہ کے کمرے کی تعریف کرتے ہوئے مغلانی کہتی ہے:

> ''تمہارا کمرہ انگریزی وضع کا ہے''(۲۱)

محمدی بیگم نے تین ناول تحریر کیے۔جن میں ''شریف بیٹی''،''صفیہ بیگم''،'' اور'' آجکل'' شامل ہیں(۲۲)۔ان کے ناولوں کو دیگر خواتین ناول نگاروں سے اپنے طرزِ بیان اور طرزِ فکر کے اعتبار سے منفرد مقام حاصل ہے۔اولین لکھنے والی خواتین ناول نگاروں کے فن اور فکر پر مولوی نذیر احمد کے اثرات کی جھلک واضح دکھائی دیتی ہے لیکن انہوں نے اپنی طرز خود ایجاد کی۔جس میں فنی اورفکری حوالوں سے ایک مختلف اور تجزیاتی طرزفکر نظر آتا ہے جبکہ کئی خواتین ناول نگار اصلاحی نقطہ نظر کے تحت جذباتیت کا شکار ہو جاتی ہیں۔جبکہ ان کے ناول کسی بھی واقعے کو غیر منطقی انداز میں یا غیر حقیقی رنگ میں پیش نہیں کرتے۔ان کے کردار بھی مثالیت کا شکار نہیں ہوتے بلکہ وہ اپنی خوبیوں اور خامیوں سمیت ناول میں متشکل ہوتے ہیں۔اس طرح ان کے ناولوں کا پلاٹ علت ومعلول کے ساتھ جڑا کہانی کے انجام تک پہنچتا ہے جس سے کہیں بھی قاری چونکنے یا غیر یقینی صورتِ حال کا شکار ہونے سے بچ جاتا ہے۔یوں کہانی میں حقیقت نگاری کا رنگ غالب آجاتا ہے۔

محمدی بیگم کا ناول ''صفیہ بیگم'' ۱۹۰۳ء میں دارالاشاعت پنجاب، لاہور سے شائع ہوا۔اس ناول میں بے جوڑ شادیوں اور بچپن کی منگنی جیسی قبیح رسم کو موضوع بنایا گیا ہے۔ یہ رویہ بھی ابتدائی بیسویں صدی کے معاشرے میں عام تھا کہ لڑکی گھر سے باہر نہ جائے اور قریبی رشتہ داروں میں ہی اس کی بچپن سے ہی منگنی ٹھہرا دی جاتی تھی ۔اس رویے کی نشاندہی یوں تو اس دور کے سبھی ناول نگاروں نے کی ہے لیکن رتن ناتھ سرشار کا ناول ''بدرالنساء کی مصیبتیں'' اس موضوع کی بھرپور عکاسی کرتا ہے ۔''صفیہ بیگم'' کا پلاٹ بھی ایک ایسی لڑکی کے خط کے ذریعے اس کی بد نصیبی کی داستان سناتا ہے جس میں وہ والدین کے غلط فیصلوں کے خلاف مزاحمت کی جرأت نہیں کرتی اور اسی کشمکش میں بالآخر موت سے ہمکنار ہو جاتی ہے ۔اور ایک خط بطور وصیت چھوڑتی ہے ۔جس میں التجا کرتی ہے کہ:

> تم اپنی اولاد کے بیاہ شادی میں جان توڑ کر چھان بین کرو۔ یہ چھان بین جس طرح ذات اور نسب کی کی جاتی ہے۔اس طرح علم کی ،صحت جسمانی کی،عادات کی،چال چلن کی،مزاج کی،کیفیت کی،اخلاق کی اور سب سے زیادہ لڑکی کی رضا مندی کی کی جائے۔'' (۲۳)

اسی طرح لڑکیوں کی شادی کے حوالے سے معاشرے کے عمومی رویے اور اشتہار برائے رشتہ کا رواج بھی اس ناول کی بعض سطروں سے واضح ہوتا ہے۔مثلاً

> بیوی: تو آخراب میں کیا کروں؟ میں تو جانوں ،تہذیب نسواں میں اشتہار۔کوئی نہ کوئی لڑکا تو مل ہی جائے گا ۔یہ اخبار عموماً بڑے بڑے معزز گھرانوں اور تعلیم یافتہ خاندانوں میں جاتا ہے، جو دیکھتا ہے یہی کہتا ہے کہ جوان بیٹی بٹھا رکھی ہے۔
>
> میاں:''بٹھا رکھی ہے،تو کیا کسی کے سر پر بٹھا رکھی ہے؟لوگ کہتے ہیں تو بکا کریں ۔ اب ہم لوگوں کے کہے سے ڈر کر اسے کسی اندھے کنوئیں میں تھوڑا دھکیل دیں گے''(۲۴)

صفیہ کی شکل میں محمدی بیگم اس دور کی تمام مظلوم لڑکیوں کا دکھ پیش کرتی ہیں جن کو شادی میں رضامندی کے حق سے محروم رکھا جاتا ہے۔وہ پڑھی لکھی ہونے کے باوجود ماں باپ کے غلط فیصلے کے آگے سر نہیں اٹھاتی۔

> ''یہ میرے دل کی کمزوری ہے اور اپنی بری بھلی تعلیم کا نتیجہ ہے کہ میں اس وقت اپنی جان سے ہاتھ دھوئے بیٹھی ہوں ۔کاش میں سخت دل محض جاہل ان پڑھ لڑکی ہوتی ۔میں نے علم حاصل نہ کیا ہوتا ۔خدا اور رسول ﷺ کے احکام نہ پڑھے ہوتے۔کیوں کہ اگر مجھے علم نہ ہوتا تو مجھے یہ خوف بھی پیدا نہ ہوتا کہ ناموافق شوہر کے حقوق خدمت ادا نہ ہونے سے میں گنہگار ہوں گی یا اس برائے نام شادی کا بعد میں جو انجام ہوگا اسے میں کس طرح کاٹوں گی۔اگر میں جاہل مطلق ہوتی تو مجھے اونچ نیچ کا مطلق خیال نہ ہوتا اور اس واقعہ کے پیش آنے سے زرا ملال نہ ہوتا یا اگر ہوتا تو اسقدر کہ میری آرزوئیں مر جاتیں نہ کہ میں خود ہی مر جاتی۔میں خوش ہوں کہ میں اس دنیا سے جانے والی ہوں''(۲۵)

مولوی ممتاز علی نے'' حقوقِ نسواں'' اور''اربعین'' میں اس مسئلے کو اسلامی حوالے سے دیکھا ہے۔(۲۶) کسی بھی جگہ

لڑکی نسبت ٹھہرا دی جاتی تھی اور یہ سوچے بغیر کہ یہ بچہ کل کو کیا نکلے گا، وہ فرشتہ ہو گا یا شیطان یہ دیکھے بغیر بس زبان دے دی جاتی تھی اور پھر اس زبان کا بھرم رکھنے یا قول کا پاس رکھنے کے لیے بیٹیوں کو بھیڑ بکریوں کی طرح کسی کے بھی ساتھ ڈولی میں بٹھا دیا جاتا تھا۔ یہی صورتِ حال ''صفیہ بیگم'' میں بھی پیش آتی ہے کہ اس کو نکاح کے مقررہ وقت تک معلوم نہیں ہے کہ وہ کس کے ساتھ شادی کے بندھن میں باندھی جا رہی ہے۔ اس کی دوست اپنی حیرت کا اظہار یوں کرتی ہے کہ ''خوب بیاہ شادی ہے۔ خیر سے دلہن کو یہ بھی خبر نہیں کہ بیاہ کس سے ہے۔'' (۲۷)

صفیہ کی ماں اور باپ کے درمیان ہونے والے مکالمے بھی اس دور کے اس قسم کے رویوں کی عکاسی کرتے ہیں جن میں اولاد کو محض ایک قول کی بھینٹ چڑھا دیا جاتا تھا:

> صفیہ کا باپ: ''کیوں میں نے پہلی ہی عید پر تمہیں روکا تھا یا نہیں؟ کہ تم اس قسم کے لین دین مت رکھو، جب لڑکا لڑکی جوان ہوں گے تب دیکھا جائے گا'' صفیہ کی ماں: ''میری تو جان جائے گی پر آن نہ جائے گی۔ ایک دفعہ زبان دے چکی ہوں۔ اب چاہے ادھر کی دنیا ادھر ہو جائے، چاہے اس بچی کا نیک نصیبا ہو، چاہے تیرے، چاہے ڈوبے۔ دوں گی تو صفدر کو ہی بیٹی دوں گی'' (۲۸)

اس ناول میں جہاں مرکزی موضوع قاری کو پوری طرح گرفت میں لے لیتا ہے وہیں ذیلی عنوانات میں بھی بین السطور بیسویں صدی کے ابتدائی عشروں میں خواتین کے رویوں اور ان کے مسائل کی جھلکیاں باآسانی دیکھی جا سکتی ہیں۔ مثلاً

> ''تم اپنی والدہ سمیت ان کے ہاں ہو آؤ'' (۲۹)
>
> ''شرم کی کیا بات ہے تمہاری اماں جو ساتھ ہوں گی، باتیں وغیرہ تو وہ کریں گی تم حال دیکھ لینا'' (۳۰)
>
> ''اگر نہ جانے دوں تو کتنا برا مانیں اور جو جانے دیتی ہوں تو یہ اور نیا ڈھنگ ہے کہ کنواری بیٹی اور بیگانے گھر جائے۔ صفیہ تو نے ڈبو دیا، میں تو کہیں کی نہ رہی'' (۳۱)
>
> ''بوا تم اپنی امی جان کو شوق سے بلا لو وہ میری بزرگ ہیں، مجھے ان سے کوئی پردہ نہیں۔'' (۳۲)
>
> ''عورتیں ایسی وہمی ہیں کہ وہ لیڈی ڈاکٹر کو بلانے نہیں دیتیں'' (۳۳)

انیسویں اور بیسویں صدی میں خواتین کے لیے پردے کی پابندی عام تھی اور بطورِ خاص شرفاء کی خواتین کے لیے پردہ صرف اسلامی روایت کا حصہ نہیں تھا بلکہ اس دور کا طبقاتی امتیاز بھی تھا۔ ایسے حالات میں عورت کا گھر سے نکل کر کمانا ناممکن نظر آتا تھا البتہ نچلے طبقے کی خواتین گھریلو ملازمائیں یا نائینیں وغیرہ چھوٹے چھوٹے اسباب پیدا کر کے کھا کما لیتی تھیں (جس کی نمائندگی ''شریف بیٹی'' میں ''بوڑھی نائین'' کی شکل میں ملتی ہے) لیکن اعلیٰ اور متوسط طبقہ کی خواتین حالات کی مجبوری کے باوجود معاشی کردار ادا کرنے سے قاصر تھیں (جیسا کہ شریفن اور اس کی ماں

، یا پھر وہ بیگم صاحبہ بھی جو کہانی کے ہر مشکل موڑ پر مشکل کشا بن کر آتی ہیں)۔اس طبقے کے لیے پردے کی پابندی ان کے خاندانی عزت و وقار کا لازمی جزو تھا۔اسی متوسط طبقے کے مسائل کو سامنے رکھتے ہوئے محمدی بیگم نے یہ ناول تحریر کیا۔'' شریف بیٹی'' میں خواتین کو مضبوط بنانے کے لیے ایک ایسا مرکزی کردار پیش کیا گیا جس کے ذریعے خواتین میں حالات کا مقابلہ کرتے ہوئے اپنے لیے مالی وسائل پیدا کرنے اور خاندان کو مضبوط کرنے کی ترغیب ملتی ہے۔جبکہ اس دور کے دیگر ناولوں میں عورت کو ایک ایسی دیوی بنا کر دکھایا گیا جس کو گھر کے ایک کونے میں ڈھک کر رکھ دیا جائے جس پر حرکت و عمل کے سب دروازے بند ہوں۔گویا وہ گڑیا گھر میں بیٹھی گڑیا ہو جس کا کام چمکیلے کپڑے پہن کر دوسروں کو خوش کرنا اور ان کا دل بہلانے کے سوا کچھ اور مصرف نہ ہو۔اس ناول میں محمدی بیگم کے ناول'' صفیہ بیگم'' کی ہیروئین اپنے ارتقاء کے ساتھ سامنے آتی ہے۔صفیہ حالات کا سامنا کرنے سے قاصر نظر آتی ہے اور موت سے ہم کنار ہو جاتی ہے۔'' شریف بیٹی'' کی ہیروئین کو بھی دکھ توڑتا ہے لیکن اس کے اندر غربت اور دیگر مسائل کے ساتھ مقابلہ کرنے کا حوصلہ اور جینے کی امنگ موجود ہے۔اس ناول کے ذریعے خواتین میں اپنی اور اپنے کنبے کی کفالت کر سکنے کا حوصلہ اور اعتماد دینے کی کوشش کی گئی ہے۔

''شریف بیٹی'' پہلی مرتبہ ۱۹۰۸ء میں لکھا گیا ،اس دور میں خواتین کے لیے نظامِ تعلیم وضع کرنے کی بحثیں جاری تھیں۔ذیل میں دو اقتباسات درج کیے جاتے ہیں جس سے گھروں کے اندر با قاعدہ سکول تو نہیں لیکن شریف بیبیوں کے لیے گھریلو مدارس کے پورے نظام کو سمجھا جا سکتا ہے۔

> ''تم یوں کرو کہ جو لڑکی تمہارے ہاں آئے اس سے پڑھائی کا روپیہ لو،(شریفن) یوں کرتے تو مجھے شرم آتی ہے۔لوگ مجھے ملانی کہیں گے۔''(۳۴)
>
> اہلِ محلّہ کو یہ شوق چڑھ آیا کہ جس طرح ہو شریفن کو اس بات پر رضا مند کیا جائے کہ وہ ہماری لڑکیوں کو پڑھا دیا کرے۔بعض نے تو اسے گھر بلا کر پڑھانے کے لیے اسے معقول تنخواہ بھی دینی کی۔مگر اس غیرت مند لڑکی نے کسی کے گھر جا کر استانی بن کر پڑھانے سے قطعی انکار کر دیا۔(۳۵)

محمدی بیگم کا ناول'' آج کل''فنی حوالے سے ان کے پہلے تمام ناولوں سے زیادہ اہم ہے۔اس ناول کو واحد متکلم کے انداز میں پیش کیا گیا ہے۔کہانی کا مرکزی کردار ایک سگھڑ ،سلیقہ مند اور تعلیم کے زیور سے آراستہ اور ظاہری خوبصورتی سے پیراستہ خاتون''فہمیدہ'' کا ہے۔یہ کردار ہر لحاظ سے مکمل ہے لیکن ایک عمومی عادت یعنی آج کا کام کل پر چھوڑنا کا شکار ہوتی ہے۔یہ بظاہر معمولی سی عادت اس کی زندگی میں اسے ایک ایسے المیے سے دو چار کرتی ہے جہاں اسکی ہنستی کھیلتی زندگی قصۂ عبرت بن جاتی ہے۔

محمدی بیگم کا ناول'' آج کل'' واحد متکلم کی تکنیک میں لکھا گیا ناول ہے۔اس ناول میں ناول نگار کی فنی پختگی ان کے موضوع اور فن کے حوالے سے سنجیدہ تخلیقی کاوش کی کامیابی کی دلیل ہے۔اس ناول کا آغاز ایک ایسے قصے سے کیا جاتا ہے جس کی ابتدا میں سب کچھ بہت اعلیٰ اور مکمل دکھایا جاتا ہے۔پھر وہ واقعات جو بظاہر معمولی اور روز

مرہ کی زندگی کے معمولات کا حصہ ہوتے ہیں،ان کے ذریعے کہانی اپنے اندر ایک بڑے المیے کے لیے فضا سازگار کرتی ہے۔بالآخر کہانی کی مرکزی کردار فہمیدہ جو اسم بامسمّٰی بھی ہے لیکن ایک عمومی عادت یعنی آج کا کام کل پر ڈالنے کی وجہ سے زندگی کی ساری خوشیاں کھو بیٹھتی ہے۔

اس ناول میں بھی طبقۂ اشراف کے طرزِ زندگی کی جھلکیاں بڑی آسانی سے دیکھی جا سکتی ہیں۔

''وہ قابلیتیں کس کام آئیں گی جب گھر ہی برباد ہو گیا، کچھ ہوش کی خبر لو اور گھر بار کی طرف توجہ کرو، جاگیر الٹی جاتی ہے ،لاکھ حکام میں آپ کی قدر و منزلت ہے۔مگر بھائی جان گھر بیٹھے پیروں کو بھی کوئی نہیں پوجتا۔سینکڑوں جلسے،بیسیوں پارٹیاں حکام بالا سے لے کر عام پبلک تک کی ہو گزریں ،مگر آپ کی صورت کسی میں نظر نہ پڑی۔احکام بھی انہیں لوگوں کی قدر کرتے ہیں جو ہر وقت ان کے پیش نظر رہیں،ان کے جلسوں میں شریک ہوں''(۳۶)

ناول''آج کل'' میں عمومی روش سے ہٹ کر اسلوب کی بجائے پلاٹ کی بنت کے ساتھ کہانی میں المیہ کو منطقی انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ایک عام قاری چھوٹے چھوٹے واقعات کے اندر چھپے ہوئے کسی بڑے حادثے کی باز گشت بڑی آسانی سے سن سکتا ہے۔

اس ناول اس میں خواتین کرداروں کے پسِ پردہ حقوقِ نسواں یا خواتین کے ساتھ معاشرے کے استحصالی رویوں کو پیش نہیں کیا گیا۔ بلکہ اس کہانی کی مرکزی کردار فہمیدہ ایک فارغ البال خاندان سے تعلق رکھتی ہے ۔اسے گھر پر تعلیم بھی دی جاتی ہے ،اسی طرح جب شادی کا معاملہ آتا ہے تو اسے اپنے گھر سے بھی زیادہ آسودہ گھر نصیب ہوتا ہے جہاں خیال رکھنے والا شوہر اس کے ہر ناز و نعم اور آرام و آسائش کا بے حد خیال رکھتا ہے ۔پھر قدرت اس پر مہربان ہو کر اسے خوبصورت اور صحت مند اولاد نرینہ عطا کرتی ہے ۔لیکن ان تمام آسائشوں کے نتیجے میں اس کی ایک عام عادت یعنی آج کا کام کل پر چھوڑنے کو اور تقویت ملتی ہے اور وہ اس قدر کاہل ہو جاتی ہے محض منہ سے حکم جاری کرنا بھی اسے محال ہو جاتا ہے۔ایک دن چھت کا جنگلہ جسے مرمت کروانے کے لیے اسے کہنے میں ایک دو دن لگ گئے اس پر سے اس کا بیٹا گر کر دارِ فانی سے کوچ کر جاتا ہے۔اس طرح یہ عام سی خامی اس کی زندگی کو تاریک کر دیتی ہے اور اس واقعے کے ردِعمل میں اس کا شوہر دوسری شادی کر کے اسے پچھتاوے کے پہاڑ تلے دب کے موت سے ہم کنار ہونے کے لیے چھوڑ دیتا ہے۔

اس کہانی کے تمام کردار بشری خامیوں کے ساتھ جلوہ گر ہوتے ہیں۔فہمیدہ کا کردار بھی فہم و فراست کی اعلیٰ مثال ہے لیکن اس کی ایک معمولی خامی اسے زمین سے جوڑ دیتی ہے۔فہمیدہ کے شوہر کا کردار ابتدائی ناولوں کے روایتی کرداروں سے بالکل مختلف ہے۔اس کے مزاج میں عجز و انکساری ہے مگر بیٹے کی وفات اسے بیوی سے بد دل کر دیتی ہے اور وہ عام جیتے جاگتے کرداروں کی طرح سخت ردِعمل کا اظہار کرتا ہے۔

یہ ناول اپنے اختتام پر ایک سبق آموز قصہ بن جاتا ہے ۔مگر اس کے باوجود یہ ناول مکالماتی اندازِ بیان ،ہیئت کے نئے تجربات اور کہانی میں واقعات کے منطقی اندازِ پیش کش کی وجہ سے کامیاب ترین ناول کہا جا سکتا ہے۔

خواتین کی زبان کا استعمال بھی ناول نگار نے بڑی فنی پختگی اور گہرے مشاہدے سے کیا ہے۔مصنفہ نے مختلف طبقات سے تعلق رکھنے والی خواتین کی زبان ان کے مطابق کمال مہارت سے پیش کی ہے مثلاً نائین کی زبانی مندرجہ ذیل مکالمے قابلِ توجہ ہیں۔

''مر دووے کچھ دیوانہ ہوا ہے؟دے دلا کر واپس لیتا ہے۔کیا واپسی کے اقرار پر دے گیا تھا؟ جا جا نالش کر۔بکری اب نہیں ملتی۔ہم کیا تیرے گھر لینے گئے تھے۔یا تجھ سے زبردستی لے لی۔ہوش کی دوا کر۔اب میں بچے کو رلواؤں اور بکری تجھے دوں۔''(۳۷)

'آج کل میں جو اسلوب پیش کیا گیا ہے وہ اس ناول کی جامعیت میں مزید اضافہ کر دیتا ہے۔خاتون ناول نگار ہونے کے ناتے محمدی بیگم مرکزی کردار فہمیدہ کے مکالموں کو بڑی روانی اور محاورات وضرب المثال کے ساتھ جوڑ کر پیش کرتی ہیں جس سے اسلوب میں برجستگی اور شگفتگی کا احساس ہوتا ہے۔ ناول کا مرکزی کردار فہمیدہ جس کا تعلق اشرافیہ سے ہے اس کے مکالموں سے اس کردار کا مقام ومرتبہ واضح ہو جاتا ہے۔

''یوسف صبح ہی صبح اٹھا اور بدستور اس جنگلے کے پاس جا کھڑا ہوا،اس کی انا نیچے بیٹھی تھی اسے تا تا کرنے لگا،کھلائی کمبخت نے جو اسے جنگلے کے پاس دیکھا تو چیختی پکارتی دوڑی۔بچوں کی عادت ہوتی ہے کہ جب ان کی طرف کوئی دوڑے تو وہ اور بھی گھبرا کر بھاگتے ہیں،آہ پیارا یوسف جو ناز اور خوشی سے کلکاری مار کر بھاگا تو میں کیا لکھوں اس سے آگے مجھ سے لکھا نہیں جاتا،یا تو میرا چاند بام پر تھا یا چشم زدن میں صحن کے پکے فرش پر پڑا نظر آیا''(۳۸)

''وہ کہتے ہیں کہ اس نے آنکھیں کھولیں اور خوب اچھی طرح میری طرف دیکھا مگر پھر ایسی آنکھیں بند کیں کہ ناشاد ماں تڑپتی ہی رہ گئی اور اس نے آنکھ کھول کر اس کا حال دیکھا:
یہ کیسی نیند آ گئی الٰہی مسافران رہ عدم کو کچھ ایسے سوئے کہ پھر نہ اُٹھے تھکے ہم ان کو جگا جگا کے''(۳۹)

اسی طرح ''صفیہ بیگم''میں بھی جب صفیہ نواب صاحب کے گھر جاتی ہے تو خواتین کے آپس کے مکالمے دلچسپ اور اپنی اپنی جگہ بڑی مہارت سے پیش کیے گئے ہیں محمدی بیگم کے ناولوں میں خواتین کا طرز بیان اپنی فنی خوبیوں کے ساتھ ساتھ اس دور کی زبان کا مزاج جاننے میں بھی بڑی مدد دیتا ہے۔محاورات اور ضرب الامثال کا استعمال بھی بڑی برجستگی اور پوری ادبی چاشنی اور رچاؤ کے ساتھ ملتا ہے۔ذیل میں درج اقتباسات میں معاشرتی رویوں کی جھلک بھی بآسانی دیکھی جا سکتی ہے۔

''سونے کے سہرے بیاہ ہو''(۴۰)''ماں باپ کو خوشیاں دیکھنی نصیب ہوں۔تمہاری ماں کا کلیجہ ٹھنڈا رہے''(۴۱)''بٹی ایڑھی دیکھ کر کہتی ہوں۔صد رحمت تمہاری عقل پر''(۴۲)''عورتیں ایسی وہمی ہوتی ہیں کہ لیڈی ڈاکٹر کو بلانے نہیں دیتیں''(۴۳)''خدا آج میری شرم رکھ لے''(۴۴)''اس موئی فرنگن کو بلایا تھا''(۴۵)''عورتوں کی عقل اوندھی ہوتی ہے''(۴۶)''ایک دفعہ زبان دے چکی ہوں،اب چاہے ادھر کی دنیا ادھر ہو

جائے'' (۴۷) ''کسی نے اولاد کو کنوئیں میں ڈالا ہو تو میں بھی ڈال دوں'' (۴۸) 'ہڈی میں ہڈی اور پیوند مل جائے'' (۴۹) ''جب جاہل تھا ،اب عالم ہے، جینٹلمین ہے'' (۵۰) ''ہائے میرے خیالی پلاؤ یونہی پکتے رہے'' (۵۱) ''ہائے صفدر نے سونے کی چڑیا اڑا دی'' (۵۲) ''یہ سب تمہاری شیخ چلی کی سی باتیں ہیں'' (۵۳) ''میں اس صورت کی اتنی بھی پروانہیں کرتا جتنی اُڑد پر سفیدی'' (۵۴) ''مجھے چلو بھر پانی میں ڈوب مرنا چاہیئے'' (۵۵) ''تل دھرنے کو جگہ نہ تھی'' (۵۶) ''تھالی پھینکو تو سر پر ٹکے'' (۵۷) ''جس جگر کے ٹکڑے کو سولہ برس تک تعویذ کی طرح گلے لگائے رکھا'' (۵۸) ''اس قدر خوبصورت کہ ہاتھ لگائے میلا ہوتا تھا'' (۵۹) ''مال مفت دل بے رحم'' (۶۰) ''اس اندھیری نگری میں خاک پلے نہ رہتا'' (۶۱) ''کاٹھ کی ہلکی پھلکی گاڑی بے پہیوں کے نہیں چلتی'' (۶۲) ''اگر میں پھوڑ ۔جاہل ۔بے تمیز ہوتی اور کچھ نہ کرتی'' (۶۳) ''کاہلی میری گھٹی میں پڑی ہوئی'' (۶۴) ''دیکھو اس کا نازک گلاب کے پھول سا بدن جوؤں کے کاٹنے سے کیسا ہو رہا ہے'' (۶۵) ''اس سے میرا ماتھا ٹھنکا اور میں مضطراب ہو کر تڑپی'' (۶۶) 'خدا کی مرضی یہی تھی' (۶۷) ''میرے کلیجے کا ٹکڑا یوں کاٹ کر نہ لے جاتے'' (۶۸)

شریفن کی ماں کی ادھیڑ بن کہیں نہ گئی (۶۹) بہتر ہے اپنے ہاتھ پاؤں ہلاؤں اور کچھ ناخونوں سے پیدا کروں۔(۷۰) ''یہ حالت ہوگئی کہ چار پائی سے لگ گئے (۷۱) ''وہ اپنا بوریا بستر لے کر ہمیشہ کے لیے عبدالغنی مرحوم کے گھر اٹھ آئی (۷۲)

''بچوں کی بہاریں دیکھنی نصیب کرے اور اتنا دے کہ گھر بھر کر باہر بھرو (۷۳) اصل بھید کی کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوتی'' (۷۴)

محمدی بیگم کے ناول ان کے معاصر مرد ناول نگاروں کی نسبت خواتین کے معاشرتی رویوں کی زیادہ گہری ،سادہ اور سچی تصویر کشی کرتے ہیں۔ان کے ناولوں میں اشراف، متوسط اور غریب تینوں طبقات سے تعلق رکھنے والی خواتین کے مسائل کو ان کے پس منظر میں رکھ کر سمجھنے اور پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔محمدی بیگم کے ناولوں میں مقصدیت کا رنگ بھی موجود ہے جیسا کہ خواتین کی تعلیم کی اہمیت کو اجاگر کرنا، پڑھی لکھی اور ان پڑھ خواتین کے ساتھ روز مرہ کے معاملات اور مسائل کو پیش کرنا،اور خواتین کو اپنے لیے اور خاندان کے لیے کفالت کرنے کا حوصلہ دینا وغیرہ مگر کہیں بھی یہ مقصد وعظ یا نصیحت کے بوجھ سے کہانی کی دلچسپی کو نقصان نہیں پہنچاتا۔اس کی ایک وجہ ان کا اسلوبِ بیان ہے جس میں وہ تخلیقی آہنگ موجود ہے جو بڑی سے بڑی بات کو بھی روزمرہ اور محاورے کی زبان میں سمجھانے کا ملکہ رکھتا ہے۔تاریخ کسی دور کے بڑے واقعات کو بیان کرنے کی تو صلاحیت رکھتی ہے لیکن ادب میں کسی بھی دور کو اس کی جزئیات کے ساتھ پیش کرنے کا ہنر موجود ہے۔محمدی بیگم کے ناول بھی خواتین کی تحریکوں کے تہذیبی اور ثقافتی تناظرات میں سمجھانے میں بے حد معاون ثابت ہوتے ہیں۔

حوالہ جات وحواشی:

(۱) ''سر سید احمد خان کا جواب ایڈریس بخدمت خواتین پنجاب''
''اے میری بہنوں! میں اپنی قوم کی خواتین کی تعلیم سے بے پرواہ نہیں ہوں ۔میں دل سے ان کی ترقی کا خواہاں ہوں۔مجھ کو جہاں تک مخالفت ہے
اس طریقۂ تعلیم سے ہے جس کے اختیار کرنے پر اس زمانے کے کوتاہ اندیش مائل ہیں۔میں تمہیں یہ نصیحت کرتا ہوں کہ تم اپنا پرانا طریقۂ تعلیم اختیار کرنے کی کوشش کرو۔وہی تمہارے لیے دین و دنیا میں بھلائی کا پھل دے گا اور کانٹوں میں پڑنے سے محفوظ رکھے گا۔''
(ڈاکٹر شیخ عبداللہ، مشاہدات و تاثرات، مرتبہ اطہر صدیقی، قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان،نئی دہلی،۲۰۱۵ء،ص۲۹۷)

(۲) ڈاکٹر شیخ عبداللہ، مشاہدات و تاثرات،مرتبہ اطہر صدیقی،قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان،نئی دہلی،۲۰۱۵ء،ص نمبر ۳۰۰۔۳۰۱

(۳) جے۔ای۔ڈی۔بیتھون(۱۸۵۷ء۔۱۸۰۱ء) پیشے کے اعتبار سے ایک اینگلو انڈین وکیل تھے،جو بیرسٹر بھی رہے،انہوں نے خواتین کی تعلیم کی کوششیں کیں۔۱۸۴۹ء میں خواتین کی باقاعدہ تعلیم کے لیے کلکتہ میں ایک ادارہ بنایا جو بعد میں بیتھون کالجز کے نام سے مشہور ہوا۔

(۴) نسرین احمد،"Muslim Leadership and Women 's Education"، مطبوعہ *Three essays collective*،اشاعت اول،نیو دہلی،انڈیا،۲۰۱۰ء،ص ۸

(۵) ''حقوقِ نسواں''میں مولوی ممتاز علی نے خواتین کے حوالے سے مذہب کی ذاتی تاویلیں پیش کر کے جس طرح ان کے حقوق کا استحصال کیا جاتا ہے ،کو موضوع بنایا گیا ہے۔اس کتاب میں نو آبادیاتی ہندوستان میں جو توہمات (Stereo-types) خواتین کے حوالے سے پائی جاتی تھیں ،ان کو بھی قرآن و حدیث کی روشنی میں رد کیا گیا ہے۔قرآنِ پاک کی تفاسیر کا بھی اس ضمن میں جائزہ لیا گیا ہے کہ اصل لفظ یا آیت کا مفہوم کیا ہے اور ہندوستانی معاشرے میں اس سے کیا مراد لیا جاتا ہے۔مثلاً لفظ''قوام'' کی مولوی ممتاز علی نے لغوی اور معنوی اعتبار سے جو تعبیر کی ہے اس کے معنی''حاکم'' کے نہیں بلکہ''کارگزار'' کے ہیں۔اسی طرح تعلیم کے حصول یا خواتین کے ناقص العقل کہے جانے کی آراء اور جائیداد میں سے خواتین کی بے دخلی کو قرآن و حدیث کی روشنی کے تناظر میں اس وقت کے ہندوستانی معاشرے کو سمجھانے اور ان کی اصلاح کرنے کی کوشش کی ہے۔اس کتاب سے مولوی ممتاز علی کی طبقۂ نسواں کے لیے ہمدردی اور ان کے مسائل کو حل کرنے کے جذبے کو سمجھا جا سکتا ہے۔بلا شبہ وہ اپنے قول کی عملی تفسیر بھی تھے جس طرح انہوں نے اپنی بیٹی اور بیوی سے سلوک رکھا وہ مثالی ہے۔

(۶) تہذیب النسواں کا باقاعدہ آغاز ۱۸۹۸ء میں ہوا۔اشاعت سے پہلے چند مشاہیر کو اس کی اعزازی کاپیاں بھیجی گئیں تو جوابی لفافوں پر گالیاں موصول ہوئیں۔اس رسالے کے اگر چہ سر سید احمد خان حامی نہ تھے مگر مجوزہ ناموں میں'' تہذیب الاخلاق'' کی طرز کا نام یعنی تہذیب نسواں ان کی رائے پر رکھا گیا۔

(۷) جاوید اختر،سید ڈاکٹر،اردو کی ناول نگار خواتین،سنگ میل پبلی کیشنز،لاہور،۱۹۹۷ء،ص۲۰

(۸) شیخ محمد اسماعیل پانی پتی، ''تاج صاحب کے والدین''، مشمولہ مجلّہ صحیفہ، تاج نمبر، شمارہ ۵۳، اکتوبر ۱۹۷۰ء، ص نمبر ۲۵

(۹) محمدی بیگم کا ناول'' شریف بیٹی'' کے حوالے سے نیلم فرزانہ کی رائے صائب نہیں ہے کیونکہ اس ناول میں اصغری جیسا کردار ''شریفن'' تو موجود ہے لیکن اس میں کوئی بھی کردار اکبری کی طرح کا تخلیق ہی نہیں کیا گیا۔ بلکہ یہ کہانی یوں بھی منفرد ہے کہ اس میں صرف ہیروئین ہے اور اس کا مقابلہ غربت اور حالات سے ہے۔ نہ کوئی اس میں مرد ہیرو موجود ہے اور نہ کوئی منفی کردار۔

'' شریف بیٹی'' پر نذیر احمد کے ناول مرآۃ العروس کا اثر پورے طور پر نمایاں ہے۔ یہاں بھی اکبری اور اصغری کے مثل دو کردار انوری اور اختری کو وضع کیا گیا ہے۔ ایک اچھائی اور نیکی کا نمونہ ہے اور دوسرا اس کے برعکس۔۔۔''

(نیلم فرزانہ، اردو ادب کی اہم خواتین ناول نگار''، براؤن بک پبلی کیشنز، دہلی، ۲۰۱۴ء، ص ۱۸)

(۱۰) گیل مینو، (Gail Minaual)، *The Secluded Scholars*، آکسفورڈ یونیورسٹی پریس دہلی، انڈیا، ۱۹۹۸ء، ص ۱۱۸

(۱۱) انور شاہین :

"Patriarchal Education and Print Journalism: their emancipating impact on Muslim of India Pakistan Journal of History and Culture,Vol xxx,No.2, 2009 مشمولہ during 1869-1908"

(۱۲) عذرا اصغر علی: The emergence of Reformist Literature about Indian Muslim Women in Urdu Language) مشمولہ *Pakistan Journal of History and Culture*,Vol xix,No.2, 1998

(۱۳) سی ایم نعیم :"Meet Bibi Ashraf" مشمولہ روزنامہ ڈان، ستمبر ۷، ۲۰۱۵ء

(۱۴) رؤف پاریکھ:'' Literary Notes: Muhammadi and Tehzeeb i- Niswan ''مشمولہ روزنامہ ڈان، نومبر ۰۲، ۲۰۱۵ء

(۱۵) حیاتِ اشرف بی بی اشرف النساء بیگم کی سوانح عمری ہے جسے محمدی بیگم نے تحریر کیا۔ بی بی اشرف بروز شنبہ غرہ شعبان ۱۲۵۶ ہجری مطابق ۲۸ ستمبر ۱۸۴۰ء کو ایک اہلِ تشیع گھرانے میں پیدا ہوئیں۔ اس کتاب کے پہلے ایڈیشن پر سنِ اشاعت درج نہیں البتہ زیرِ استعمال نسخے پر ۱۹۱۲ء درج ہے جو محمدی بیگم کے انتقال کے بعد مولوی ممتاز علی نے رفاہِ عام سٹیم پریس لاہور سے شائع کروایا۔

(۱۶) محمدی بیگم نے بچوں کے لیے کئی نظموں اور لوریوں کی کتابیں بھی لکھیں۔ جن میں '' تاج گیت'' (ننھے بچوں کے لیے آسان گیت)، ''خوابِ راحت'' (دہلی کی مشہور لوریاں)، '' پان کی گلوری''، (پان کی تعریف میں ایک دلچسپ نظم)، شامل ہیں۔ ان کے علاوہ انہوں نے بچوں کے لیے دو تصویری کہانیوں کے ساتھ سلیس اور دلچسپ کہانیاں بھی لکھیں۔ جن میں '' امتیاز پچیسی'' (پچیس آسان کہانیوں کا مجموعہ) اور '' دلپسند کہانیاں'' اور '' علی بابا چالیس چور شامل ہیں۔ '' تاج پھول''، '' ریاض پھول''، چوہے بلی نامہ''، تین بہنوں کی کہانیاں'' بھی بچوں کی تعلیم و تربیت کے لیے لکھیں۔

(۱۷) محمدی بیگم نے خواتین کی تعلیمی ضرورتوں کے ساتھ ان کی تربیتی ضرورتوں کو بھی سمجھا۔ ان کو گھر بیٹھے ایک ایسی گائیڈ فراہم

کرنے کی کوشش کی جس سے وہ سوسائٹی کے بدلتے ہوئے مزاج کو سمجھیں اور اس کے مطابق اپنے آپ کو ڈھالیں۔اس سلسلے میں ان کی کتاب ''آدابِ ملاقات''زنانہ میل جول کے مہذب طریقے، ۱۹۰۴ء میں شائع ہوئی۔اسی طرح ''رفیقِ عروس'' میں نئی دلہنوں کو نئے گھر میں جا کر سسرال میں کیسے میل جول رکھنا چاہیے،اس بارے میں مفصل رہنمائی کرتے ہے۔''سگھڑ بیٹی''، میں نوعمرلڑکیوں کی پرورش اور ان کو معاشرے کا بہتر فرد بنانے کے طریقے درج ہیں۔''مشیرِ مادر'' میں ماؤں کو بچوں کی صحت کے مسائل سے لے کران کی تربیت کے لیے بھی رہنمائی دی گئی ہے۔

(۱۸) ''خانہ داری'' اور''نعمت خانہ'' میں خواتین کو کھانا پکانے،گھریلو معاملات کواحسن انداز میں چلانے کے طریقے بتائے گئے ہیں،واضح رہے کہ تہذیب نسواں میں بھی خانہ داری کے لیے بھی کچھ اوراق مختص کیے جاتے تھے۔

(۱۹) محمدی بیگم،صفیہ بیگم،باہتمام تاج وحجاب،دارلاشاعت پنجاب،لاہور،۱۹۵۹ء، ۲

(۲۰) ایضاً ، ص۹

(۲۱) ایضاً ، ص۸

(۲۲) محمدی بیگم نے ان ناولوں کے علاوہ ایک قصہ چندن ہار کےعنوان سے بھی تحریر کیا،لیکن یہ طویل کہانی ہے اسے ناول نہیں کہا جا سکتا۔

(۲۳) محمدی بیگم،صفیہ بیگم،باہتمام تاج وحجاب،دارلاشاعت پنجاب،لاہور،۱۹۵۹ء،ص۹۲

(۲۴) ایضاً ، ص۳۸

(۲۵) ایضاً ، ص۹۲

(۲۶) حقوقِ نسواں میں مولوی ممتاز علی نے اس مسئلے سے بھی بحث کی ہے کہ اسلام شادی سے پہلےلڑکی اورلڑکے کو دیکھنے کی بھی اجازت دیتا ہے اور رضا مندی کے لیےتو ہر حال میں پوچھے جانے کی تاکید کی گئی ہے۔اس کے علاوہ انہوں نے ایک کتاب اربعین میں ان احادیث کوبھی یکجا کر دیا جس میں معاشرے کی اصلاح کا پہلو تھا۔اس میں خواتین کے اکٹھے باجماعت مگر مردوں کی قطاروں کے پیچھے نماز ادا کرنے کا حکم ہے،کوحوالوں کے ساتھ پیش کیا ہے۔عیدین کے اجتماع میں شرکت،پردے کےمتعلق بحث کوبھی زیرِ بحث اسلام کی رو سے پیش کیا گیا ہے)

(۲۷) محمدی بیگم،صفیہ بیگم،باہتمام تاج وحجاب،دارلاشاعت پنجاب،لاہور،۱۹۵۹ء،ص۸۱

(۲۸) ایضاً ، ص۲۶-۲۷

(۲۹) ایضاً ، ص۱۰

(۳۰) ایضاً ، ص۱۱

(۳۱) ایضاً

(۳۲) ایضاً ، ص۱۷

(۳۳) ایضاً ، ص۱۰

(۳۴) محمدی بیگم،شریف بیٹی،مطبوعہ یونین سٹیم پریس لاہور،۱۹۱۸ء،ص۴۹

(۳۵) ایضاً ، ص۴۷

(۳۶) محمدی بیگم،آجکل،دارلاشاعت پنجاب لاہور،۱۹۲۰ء،ص۱۵

(۳۷) ایضاً ، ص ۳۸
(۳۸) ایضاً ، ص۴۲
(۳۹) ایضاً ، ص۴۴
(۴۰) ''صفیہ بیگم''،ص۶
(۴۱) ایضاً ، ص ۶
(۴۲) ایضاً ، ص۷
(۴۳) ایضاً ، ص۱۰
(۴۴) ایضاً ، ص۱۴
(۴۵) ایضاً ، ص۲۲
(۴۶) ایضاً ، ص ۲۶
(۴۷) ایضاً ، ص ۲۷
(۴۸) ایضاً ، ص ۲۷
(۴۹) ایضاً ، ص ۴۵
(۵۰) ایضاً ، ص۴۷
(۵۱) ایضاً ، ص ۵۵
(۵۲) ایضاً ، ص ۵۸
(۵۳) ایضاً ، ص ۵۹
(۵۴) ایضاً ، ص ۶۹
(۵۵) ایضاً ، ص۸۰
(۵۶) ایضاً ، ص ۸۹
(۵۷) ایضاً ، ص ۸۹
(۵۸) ایضاً ، ص۹۴
(۵۹) آجکل،ص۱۱
(۶۰) ایضاً ، ص۱۲
(۶۱) ایضاً ، ص۱۴
(۶۲) ایضاً ، ص۱۷
(۶۳) ایضاً ، ص۱۶
(۶۴) ایضاً ، ص،۱۷
(۶۵) ایضاً ، ص۱۸
(۶۶) ایضاً ، ص۳۷

(۶۷) ایضاً ، ص۴۵

(۶۸) ایضاً ، ص۵۴

(۶۹) ''شریف بیٹی''،ص۲

(۷۰) ایضاً ، ص۲

(۷۱) ایضاً ، ص۱۶

(۷۲) ایضاً ، ص۲۰

(۷۳) ایضاً ، ص۲۲

(۷۴) ایضاً ، ص ۴۸